ماہنامہ
پیام عرفات
رائے بریلی

جلد نمبر ۱ شمارہ نمبر ۷
جولائی ۲۰۰۹ء/ رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

سرپرست
حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ
(صدر، دارِعرفات)

نگران
مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی مدظلہ
(جنرل سکریٹری، دارِعرفات)
مولانا احمد علی حسنی ندوی مدظلہ
(ڈائریکٹر، دارِعرفات)

مجلس ادارت
بلال عبدالحی حسنی ندوی
مفتی راشد حسین ندوی
عبدالسبحان ناخدا ندوی
محمود حسن حسنی ندوی
محمد حسن ندوی

معاون ادارت
محمد نفیس خاں ندوی

فی شمارہ: ۷ روپے سالانہ: ۷۰ روپے
اعزازی (سالانہ) ۵۰۰ روپے

مرکز الامام أبی الحسن الندوي
دار عرفات ،تکیہ کلاں
رائے بریلی (یوپی) ۲۲۹۰۰۱

E-Mail: alnadwi@yahoo.com

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس ، اے ، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں ، سبزی منڈی ، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ''پیام عرفات''، مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اصحاب اقتدار کی ذمہ داریاں

بلال عبدالحی حسنی ندوی

موجودہ دور ہی میں کیا ہر زمانہ میں اقتدار کو ایک دودھاری گائے سمجھا گیا ہے، حصول اقتدار کے پیچھے بنیادی طور پر یہی مقصد کارفرما ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ عزت و دولت بٹوری جائے، یہی وجہ ہے کہ اس کو حاصل کرنے کے لیے لوگ جان کی بازی لگا دیتے ہیں، انتخابات میں امیدواروں کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے، ان کو جان وتن کا ہوش نہیں رہتا، صرف یہی ایک فکر ہوتی ہے کہ وہ کس طرح سیٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہوجائیں، شاہی نظام حکومت میں تو یہ بات بالکل صاف تھی لیکن جمہوری نظام میں بھی تقریباً یہی صورت حال سامنے ہے، اس کے پیچھے وہی خودغرضانہ ذہنیت کارفرما ہے جس نے آج پوری دنیا کو جوے کی منڈی بنا دیا ہے، اس میں کسی کی جیت ہے تو کسی کی ہار، اس ہار جیت کے آگے کوئی سوچنے کو تیار نہیں ہوتا، نہ کسی کی نگاہ ٹوٹے ہوئے دل پر ہوتی ہے نہ شکستہ ضمیر پر، ہر شخص جاہ ومنصب اور مال ودولت کے پیچھے بھاگ رہا ہے، نہ اس کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے نہ انسانیت کا درد ہے۔

ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں یہ طرز فکر اور طرز عمل حد درجہ تشویشناک ہے، اہل حکومت کی بہت بڑی ذمہ داری ہے، پورا ملک یہاں کے عوام، یہاں کی پیداوار، اس کی متناسب تقسیم، عوام کی ضروریات، ان کے مختلف حالات اور تقاضوں کو سمجھنا اصحاب اقتدار کے بنیادی فرائض میں سے ہے، کسی طرح کی فرقہ بندی یا جنبہ پروری سے ایسا لاوہ پھوٹ سکتا ہے کہ پھر ملک کا سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔

عام طور پر اس طرح کی جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ ذہنی آزادی کے تصور سے پیدا ہوتی ہیں، اگر کسی کے ذہن میں ذرا بھی گرفت کا تصور ہوگا تو وہ دس بار سوچے گا، اعلی اقتدار پر پہنچ جانے والا سوچتا ہے کہ اس سے پوچھنے والا کون ہے، طبعی طور پر امانت و دیانت، شرافت و مروت کا تو وجود ہی مشکل ہوتا جارہا ہے، جب تک کسی پکڑ کا اندیشہ نہیں ہوتا انسان خالص خودغرضانہ ذہنیت کے ساتھ کام کرتا ہے۔

آخری نبی حضرت محمد مصطفی ﷺ نے ہر میدان میں رہنمائی فرمائی ہے، کسی بھی نوعیت کے اقتدار حاصل کرنے والے کو آپ ﷺ نے نصیحت فرمائی کہ اس سے اس کی رعایا کے بارے میں مرنے کے بعد پوچھا جائے گا، ایک گھر میں اگر کوئی گھر کا ذمہ دار ہے تو وہ بھی مسئول ہے، اس سے بھی اس کی بیوی بچوں کے بارے میں سوال ہوگا کہ اس نے حق ادا کیا یا حق تلفی کی، ظاہر ہے جس کو پورے ملک کا اقتدار ملا ہو اس کی ذمہ داری کیسی بڑی ہے، یقیناً اگر اللہ کا ڈر پیدا ہوجائے تو انسان کسی بھی حق تلفی پر دس مرتبہ سوچے گا، اس کے سنگین نتائج پر غور کرے گا، اور مسئلہ صرف آخرت کا نہیں ہے مسئلہ دنیا کا بھی ہے، کوئی بھی حکومت ظلم کے ساتھ، حق تلفیوں کے ساتھ طویل عرصہ تک نہیں چل سکتی، اس کا زوال یقینی ہے اور تاریخ میں اس کی مثالیں بھری پڑی ہیں۔

ہندوستان جیسے بڑے ملک میں جہاں پیدا کرنے والے نے بڑی صلاحیتیں رکھی ہیں اور بڑے ذخیرے یہاں پیدا کیے ہیں اگر قائدین اور اہل حکومت خلوص کے ساتھ یہ ارادہ کرلیں کہ ہمیں اس ملک کو آگے بڑھانا ہے اور اس کو ترقی دینی ہے، یہاں امن وامان کا ماحول قائم رکھنا ہے اور یہاں کے مختلف طبقوں میں باہمی میل ملاپ کی فضا بنانی ہے تو یقیناً جلد ہی یہ ملک ایک سپر پاور کی شکل میں دنیا کے منظر نامہ پر ابھرے گا۔

دو چیزیں ایسی ہیں جن کے پیدا ہوجانے سے کوئی ملک آگے نہیں بڑھ سکتا، ایک فرقہ واریت اور طبقاتی کشمکش دوسرے نکما پن اور رشوت خوری، افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اس ملک کے درخت اقبال کو گھن کی طرح لگ گئی ہیں اور اندر ہی اندر چاٹتی چلی جارہی ہیں، ایسی صورت حال میں حکومت کی خاص طور پر بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر طرح سیاسی، مذہبی، طبقاتی حدود وقیود سے اوپر اٹھ کر ملک کی فضا کو بہتر بنانے کی کوشش کرے اور رشوت خوری اور نکمے پن کا جو ناسور پیدا ہو گیا ہے اس کو دور کرنے کے لیے بہتر اور مؤثر اقدام کرے تاکہ ملک کے رہنے والوں کو اطمینان نصیب ہو اور یہ ملک دنیا کے نقشہ میں بلند مقام حاصل کرے اور دوسروں کو سبق دینے کی پوزیشن میں آجائے۔

عام طور پر اقتدار میں آنے کے بعد انسان سب کچھ فراموش کردیتا ہے، وہ سارے وعدے بھول جاتا ہے، اس کو یہ بھی یاد نہیں رہ جاتا کہ خواہ کچھ مدت یہ سب کچھ گوارا کرلیا جائے لیکن یہ چلنے والی چیز ہی نہیں ہے، حکومت کا استحکام ملک کے استحکام سے وابستہ ہے اور ملک کے استحکام کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ کرپشن دور کیا جائے اور انسانی بنیادوں پر ہمدردیاں استوار کی جائیں، دیکھنا یہ ہے کہ نئی حکومت ان اصولوں پر کس حد تک پوری اترتی ہے؟

ظلم -قوموں کے زوال کا سبب

مولانا محمد واضح رشید حسنی ندوی

اگر کسی ایسے مفکر سے جس کا موضوع تاریخ ہو اور قوموں کے اتار چڑھاؤ اور انسانی طبقات کے عروج و زوال سے وہ واقف ہو، یہ دریافت کیا جائے کہ تاریخ میں کون سی ایسی حقیقت ہے جو اٹل و لازوال ہے اور اس میں تغیر و تبدیلی نہیں ہوتی، اور وہ کون سا ایسا درس عبرت ہے جس کا تاریخ اعادہ کرتی رہتی ہے؟ تو وہ جواب دے گا کہ ظلم و زیادتی کے طریقے اور جبر و استبداد کے وسائل دلوں کو خاموش کرنے میں ہمیشہ ناکام رہتے ہیں، اور جو طاقتیں ظلم و زیادتی کے مرحلہ میں داخل ہوتی ہیں، وہ بہت جلد مقہور و مجبور ہو کر اس مرحلہ سے نکلتی ہیں، اور انجام یہ ہوتا ہے کہ مغلوب غالب بن جاتا ہے اور قاہر و ظالم کو شکست کا منہ دیکھنا پڑتا ہے، تاریخ کا یہی وہ فیصلہ ہے جو کبھی بدلتا نہیں۔

ظلم و زیادتی اگر کامیاب حربہ اور کارگر وسیلہ ہوتا تو دنیا کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا اور بعض تہذیبوں اور قوموں کے عروج و اقبال اور دوسری تہذیبوں اور قوموں کے ادبار و زوال کے واقعات تاریخ میں پیش ہی نہ آتے، بلندی و رفعت اور پستی و زوال ایک دوسرے سے مربوط ہوتے ہیں، اور عروج و اقبال اور ادبار و زوال یکے بعد دیگرے آتے رہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں اشتراکی مفکرین بڑی غلطی کا شکار ہوئے ہیں، انہوں نے طبقاتی کشمکش کی حتمیت و ابدیت اور مظلوم طبقوں کے غلبہ و تفوق کے تصور کی دعوت دی لیکن اپنے نظام حکومت کے قیام کے بعد (جس کو وہ کشمکش کا خاتمہ اور آخری مرحلہ سمجھتے تھے) دوسری کشمکش سے انہوں نے اپنی آنکھیں موند لیں اور آخر انہی مشکلات و پریشانیوں میں وہ بھی گھر گئے جن سے ان کے پیش رو دو چار ہو چکے تھے، اور جس قہر و استبداد اور ظلم و ستم کی پہلے مخالفت کرتے چلے آئے تھے، اسی ظلم و استبداد کے راستے کو خود انہوں نے اپنا لیا۔

تاریخ فہمی کی اس غلطی کے نتیجہ میں، موجودہ دنیا کے بہت سے لیڈروں نے ایسے وسائل و اسباب اور منصوبے تیار کیے جن سے کسی کو نفع اور فائدہ نہیں بلکہ اس کے برعکس یہ چیزیں الٹے نتائج برآمد ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ کتنی تعجب خیز اور حیرت انگیز بات ہے کہ جنہوں نے اپنے مقاصد اور ارادوں کی تکمیل کر لی اور ان کی تحریکیں کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہوئیں، اور ظلم و استبداد کے وسائل پر، ان کو غلبہ اور فتح حاصل ہوا اور جنھوں نے ظالم نظاموں اور استبدادی حکومتوں کی مخالفت کی اور اپنی آنکھوں سے ان کا زوال و خاتمہ دیکھا وہ خود سابقہ ظالم حکمرانوں کی روش اختیار کیے ہوئے ہیں اور ان کے پیش رو حکام جس جال میں پھنس چکے تھے اسی جال میں یہ اپنے آپ کو گرفتار کرا رہے ہیں اور سابقہ حکمرانوں کے مثل یہ بھی انجام بد سے دوچار ہو رہے ہیں، تاریخی واقعات و حوادث سے عبرت حاصل کرنے اور تاریخ کو سمجھنے میں اس سے زیادہ عظیم دھوکہ اور کیا ہو سکتا ہے!

موجودہ صدی کے اوائل سے لے کر اس وقت تک تاریخ نے متعدد ایسے نظامہائے حکومت کو زوال پذیر ہوتے دیکھا جو قتل و غارت گری، ظلم و استبداد اور قہر و سختی کرنے، مخالفین کا صفایا کرنے اور مخالف عناصر کا قلع قمع کرنے، اور تمام دوراز اور راستے ان کے لیے بند کر دینے میں اپنی معاصر حکومتوں سے بڑھے ہوئے تھے، لیکن ان کو خود آخر کار طوق و سلاسل سے گذرنا پڑا اور ان کا برا حشر ہوا، آج ان کا نہ کوئی نشان ہے اور نہ کوئی ان کا نام ہی لیتا ہے، جبکہ یہ ان لوگوں کی حکومتیں تھیں جن کا سکہ چلتا تھا، اور جن کے سامنے ادب و احترام میں گردنیں جھکی رہتی تھیں، مگر آہ! آج کی طاقتیں بھول گئیں تاریخ کے مزاج کو، اور ان کو یاد نہیں رہا تاریخ کا یہ درس کہ طاقت و قوت اور ضعف و کمزوری دونوں شب و روز کی طرح گردش کرتے رہتے ہیں۔

سامراجی قوتیں جو ساری دنیا پر چھائی ہوئی تھیں، زوال کا شکار ہو گئیں اور غلاموں کی طرح زندگی بسر کرنے والی کمزور قوموں کو آزادی نصیب ہوئی، روس میں ظالم و جابر قیصر حکومت پر مظلوم مزدوروں کو غلبہ حاصل ہوا، اور اس مٹھی بھر جماعت کو جس نے یہ ستم جھیلے اور سختیاں برداشت کیں، غلبہ و تفوق نصیب ہوا۔ اور نہ جانے کتنے ظالم و جابر اور سرکش و مکار حکمرانوں کا تختہ الٹ گیا۔ ہٹلر (جو ظلم و استبداد کی علامت سمجھا جاتا ہے) اس کو اور اس کی نازی جماعت کو زوال ہوا، برطانیہ کی عظیم الشان سلطنت کا (جس کے رقبہ کی وسعت کا یہ عالم تھا کہ سورج اس کی سلطنت میں کبھی غروب نہیں ہوتا تھا) یہ حال ہوا کہ سمٹتے سمٹتے اتنی رہ گئی کہ اب دنیا کے چھوٹے ممالک میں شمار کی جانے لگی ہے اور عالمی سیاست میں اس کا کوئی وزن باقی نہیں رہا، حالانکہ کچھ مدت قبل اس کے قبضہ میں دنیا کی کنجیاں تھیں، مگر اب اس کا دبدبہ جاتا رہا اور اس کے معاون اس طرح ختم ہوئے جیسے پانی میں نمک گھل کر اپنا وجود کھو دیتا ہے، اور عظمت و کبریائی کے جو الفاظ اس کے لیے مستعمل تھے، ان کا مفہوم کو بدل دیا گیا اور عظمت و کبریائی کے بجائے کبرسنی اور قدامت مراد لی جانے لگی، ہر قوت کا یہی انجام ہوتا ہے، خواہ وہ انفرادی ہو، خواہ اجتماعی، کوئی فرد ہو یا کوئی سلطنت و حکومت۔

یہودیوں کے دیکھ لیجئے۔ اسرائیلی لیڈروں کی ایک تعداد کو ابھی تک ہٹلر کے دور حکومت کی سختیاں یاد ہیں اور وہ نسل ابھی موجود ہے جو تباہی و بربادی کا شکار ہوئی تھی، لیکن موجودہ طاقت و قوت نے ان پر جادو کر رکھا ہے، اور نگاہوں پر پردے ڈال دیے ہیں جس کی وجہ سے انھیں اپنی ابتدا اور اپنا آغاز یاد نہیں رہا اور وہ اپنی حقیقت کو کچھ بھول سے گئے ہیں، یہ عدم واقفیت اور لاعلمی ان کو تاریخ کے اس جال میں گرفتار کروا دے گی جو ان کے لیے بچھا ہوا ہے اور وہ عالم غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

فلسطینی جو یہودیوں کے ظلم و ستم کو جھیل رہے ہیں ایک نہ ایک روز ضرور فتح مند ہوں گے اور وقت کے فرعونوں پر ان کو قوت و غلبہ حاصل ہوگا کیونکہ قانون تکوینی یہی ہے اور تاریخ کا فیصلہ بھی یہی ہے، اور جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں وہ نہایت ٹھوس، لازوال اور اٹل حقیقت سے لاعلم ہیں، اس تاریخی ابدی حقیقت کا علم یہودیوں کو اچانک ہوگا۔

فلسفۂ اخلاق، مذاہب عالم اور تاریخی تجربات کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سختی و ظلم اور سرکشی و زیادتی جب حد سے بڑھ جاتی ہے اور پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو اس کو زوال ہو جاتا ہے اور فرشتۂ اجل ظالم کے پاس پیام موت لے کر آ پہنچتا ہے، یہی سنت الٰہی اور قانون تکوینی ہے جس میں تغیر و تبدیلی نہیں ہوتی۔

ناپ تول میں کمی کا وبال

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دعوت توحید تمام انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا بنیادی مقصد رہا ہے، ہر نبی نے اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے سب سے پہلے یہی دعوت دی: "**یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ**" (اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے علاوہ تمہارا کوئی معبود نہیں)، اس طرح ہر نبی نے دعوت توحید کے بعد اپنی اپنی قوم کی برائیوں کا تذکرہ کیا اور ان کو دور کرنے کی دعوت دی، لیکن دو حضرات پیغمبر ایسے ہیں کہ دعوت توحید کے ساتھ ساتھ ان کی بعثت کے مقصد میں ان کی قوم کی بیماریوں کے علاج کو بھی شامل کیا گیا؛ ایک حضرت لوطؑ دوسرے حضرت شعیبؑ۔ حضرت لوطؑ کی قوم بے حیائی میں مبتلا تھی، جب انہوں نے حضرت لوطؑ کی بات نہ مانی تو ان پر سخت عذاب آیا اور وہ سب ہلاک کر کے رکھ دیے گئے۔ حضرت شعیبؑ کی قوم تاجر پیشہ تھی اور ان کا کاروبار عروج پر تھا لیکن کاروبار میں ڈنڈی مارنا اور ناپ تول میں کمی کرنا ان کی عادت بن گئی تھی، حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی تو انہوں نے اپنی قوم کو خطاب کر کے فرمایا: "**یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ ولا تنقصوا المکیال والمیزان إني أراکم بخیر وإني أخاف علیکم عذاب یوم محیط**" (اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی پروردگار نہیں، اور ناپ تول میں کمی مت کرو، میں تمہیں مزے میں دیکھ رہا ہوں اور مجھے تمہارے سلسلہ میں گھیر لینے والے دن کے عذاب کا ڈر ہے) لیکن ان کی قوم نے بات نہ مانی اور وہ بھی عذاب کا شکار ہوئے۔

موجودہ دور میں یہی دو بیماریاں ہیں جو تیزی سے بڑھتی جارہی ہیں، امت کا بڑا طبقہ ان کا شکار ہو رہا ہے، اور ان کو ایک فن بنا دیا گیا ہے، بہت سے لوگ ان کی ہلاکت خیزی کو بھی نہیں سمجھتے اور ان میں مبتلا ہوتے جاتے ہیں۔

مال ومتاع کی محبت یا اس کی طرف میلان کم وبیش تقریباً سب ہی میں پایا جاتا ہے، لیکن جب اس میں توازن بگڑتا ہے تو آدمی حلال وحرام کی تمیز کھو دیتا ہے پھر وہ صرف یہ سوچتا ہے کہ کہاں سے اس کی جیب بھرے اور اس کے بیلنس (Balance) میں اضافہ ہو، مال کی حد سے بڑھتی ہوئی محبت ہی کے نتیجہ میں وہ ناپ تول میں کمی کرتا ہے، ڈنڈی مارتا ہے، معاملات صاف نہیں کرتا اور اس کوشش میں رہتا ہے کہ کسی طرح اس کی دولت بڑھتی جائے، مغرب کے مادہ پرستانہ ذہن نے اس کو اور ہوا دی ہے، اور اس کی بہت سی ترقی یافتہ شکلیں اہل دنیا کے سامنے پیش کر دی ہیں، کوئی یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے، اور کن کن نقصانات کا سامنا اس کی وجہ سے کرنا پڑے گا، انسان فوری فائدہ کو دیکھتا ہے، اس کے مزاج میں عجلت پسندی رکھ دی گئی ہے وہ اسی سے کام لیتا ہے اور فوراً جیب و دامن بھرنا چاہتا ہے۔

خاتم انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے قیامت تک کے لیے اور پوری انسانیت کے لیے ایسی رہنمائی فرمادی ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا ہے، آنحضرت ﷺ نے امراض بھی بتائے اور ان کا علاج بھی بتایا، اسی طرح آپ ﷺ نے اعمال کے خواص بھی ارشاد فرما دیے تاکہ انسان نتائج سے ہوشیار رہے اور ہر کام سے پہلے (خواہ وہ ظاہری طور پر کتنا ہی سودمند ہو) خوب سوچ لے کہ اس کے کیا نتائج نکلنے والے ہیں، ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے بارے میں آپ ﷺ کا ارشاد ہے: "**و لم ینقصوا المکیال و المیزان الا أخذوا بالسنین و شدة المؤنة و جور السلطان علیهم**" (اور جب کوئی قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے تو وہ قحط سالی، سخت مصائب اور حکمرانوں کے مظالم میں گرفتار ہو جاتی ہے)۔

موجودہ زمانہ میں ناپ تول میں کمی کی دسیوں شکلیں پیدا ہو گئی ہیں اور اس میں لوگوں نے اپنی عقل کا بڑا حصہ لگایا ہے اس کے نتیجہ میں پوری دنیا جن مصائب کا شکار ہو رہی ہے وہ آنحضرت ﷺ کی صداقت کا ایک مظہر ہے۔

پوری دنیا کے لیے آج ایک بڑا مسئلہ پانی کا ہے، جس طرح تیزی کے ساتھ پانی کی کمی ہوتی جارہی ہے آگے چل کر یہ مسئلہ دنیا کے لیے ایک بڑی مصیبت کی شکل میں سامنے آسکتا ہے، بعض بعض علاقوں میں وہ شکلیں سامنے آچکی ہیں، بعض ماہرین کا کہنا ہے کہ اگلی عالمی جنگ پانی کے مسئلہ پر چھڑے گی، دنیا کے مختلف علاقوں میں غذائی مسائل بھی کھڑے ہوتے رہتے ہیں، ہزار وسائل کے بعد بھی یہ مسائل پوری دنیا کے لیے ایک تازیانہ ہیں، جہاں تک سخت حالات کا تعلق ہے تو اس سے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی تقریباً ہر شخص دوچار ہے، نہ کام میں برکت ہے نہ مال میں، بڑے بڑے اصحاب ثروت حالات کی ابتری کی شکایت کرتے ہیں، ہزار سہولتوں کے باوجود لوگ مصائب میں گرفتار ہیں، ان کو دور کرنے کی ظاہری تدبیریں تو کی جاتی ہیں لیکن سبب کو جاننے کی کوئی کوشش نہیں کرتا، اسی کا نتیجہ ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جارہے ہیں۔

جہاں تک حکومتوں کے استبداد کا تعلق ہے تو عجیب بات یہ ہے کہ جمہوریت کے باوجود اکثر ملکوں میں اقتدار پر قابض لوگوں نے عوام کے جذبات سے کھلواڑ کرنا اپنا پیشہ بنا لیا ہے، مسلمان ملکوں میں یہ بات زیادہ دیکھنے میں آتی ہے، ایک آدمی اقتدار میں آتا ہے تو جمہوری ملک کہلانے کے باوجود بھی دسیوں سال نہیں بلکہ تاعمر وہ کرسی نہیں چھوڑتا، عوام پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں، کسی میں دم نہیں جو لب کشائی کر سکے، کوئی غور نہیں کرتا کہ اس کے پیچھے کون سے اسباب کارفرما ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ نے حقائق بیان فرما دیے ہیں، ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے، حالات کی تبدیلیاں بہت کچھ سبق دیتی ہیں ان کے اسباب و محرکات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، آج کی مادی دنیا میں جو بھی تجزیے کیے جاتے ہیں وہ صرف ظاہری اسباب ونتائج پر مشتمل ہوتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسائل کے حل کے نام پر جو بھی کوشش ہو رہی ہے وہ نقش بر آب ثابت ہو رہی ہے، جب تک اصل تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی جائے گی حالات میں کچھ تبدیلی خواہ نظر آنے لگے لیکن ان کو بدلا نہیں جاسکتا، اور یہ ذمہ داری بطور خاص ان لوگوں پر جن کے پاس آخری نبی ﷺ کے واسطہ سے حقیقتوں کا خزانہ ہے۔

زندگی کا لطف-عقیدۂ آخرت

عبدالسبحان ناخدا ندوی

ایک شخص ہرے بھرے باغ میں مزے لوٹ رہا ہے، ٹھنڈی ہواؤں سے لطف اندوز ہو رہا ہے، پرندوں کے مسحور کن نغمات سے جھوم رہا ہے، قسم قسم کے پھلوں سے کام ودہن کو لذت بخش رہا ہے، ہر طرح کی خوشیاں اسے حاصل ہیں، لیکن یقینی طور پر وہ یہ بھی جانتا ہے کہ جلد ہی یہ باغ اجڑ جائے گا اور اسے یہاں سے نکلنا پڑے گا، لطف وراحت کے یہ دن ہمیشہ نہیں رہیں گے، اس کی زندگی کا ہر آنے والا دن اسے باغ سے نکالے جانے والے دن سے قریب کر رہا ہے۔ ایک دوسرا شخص ہے، جو قید و بند کی کچھ صعوبتیں برداشت کر رہا ہے، حاکم اعلیٰ کی طرف سے عائد پابندیوں کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے، جو کرنے کو کہا جا رہا ہے وہی کر رہا ہے، جس سے منع کیا جاتا ہے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا، اس کی زندگی پوری کی پوری ایک خاص نظام کی پابند ہے، اس سے بال برابر ہٹنے کی اسے اجازت نہیں، لیکن وہ یقینی طور پر یہ جانتا ہے کہ جلد ہی اس قید و بند کی صعوبتوں سے وہ آزاد ہو جائے گا، اسے ایک ایسی کھلی فضا مل جائے گی جہاں سب کچھ اس کی خواہشات کے مطابق ہوگا، من پسند چیزیں کھائے گا، من چاہے محلات میں ٹھاٹ کرے گا، آرام دہ باغات میں لطف وراحت کے مزے لوٹے گا، زندگی کا ہر آنے والا دن اسے حقیقی آزادی کی طرف لے جا رہا ہے۔

ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ ان دو انسانوں میں کسے بے چین ہونا چاہیے، اور کسے مطمئن رہنا چاہیے، ہمارا خیال یہ ہے کہ تھوڑی سی عقل رکھنے والا بھی یہی بتائے گا کہ حقیقی ذہنی آسودگی دوسرے شخص کو حاصل ہے، پہلا شخص لاکھ مسرور دکھائی دے وہ کبھی ذہنی طور پر آسودہ و مطمئن نہیں ہو سکتا اس لیے کہ اس کا مستقبل مخدوش ہے، جب کہ دوسرے کا مستقبل روشن ہے، فیصلہ ہمیشہ نتیجہ کے لحاظ سے کیا جاتا ہے، خود قرآن کریم نے حال کے مقابلہ میں مستقبل پر نظر رکھنے کی تاکید کی ہے، یہی اعلیٰ درجہ کی دانشمندی ہے: "**یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ و لتنظر نفس ما قدمت لغد و اتقوا اللہ**" (اے ایمان والو، اللہ سے ڈرو، ہر انسان یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے، بس اللہ سے ڈرتے رہو)۔ یہی فرق ہے عقیدہ آخرت کو ماننے والوں اور اس عقیدہ کو تسلیم نہ کرنے والوں کے درمیان، پہلا طبقہ ہمیشہ "کیا ہوگا" پر نگاہ رکھتا ہے اور اپنے مستقبل کو محفوظ رکھنے کے لیے میدان کارزار میں کود پڑتا ہے، زخم کھا رہا ہے، صدمے سہ رہا ہے، مشقت اٹھا رہا ہے، محنت کر رہا ہے، جگر گھلا رہا ہے، پتہ پانی کر رہا ہے، زندگی کے ہر چیلنج کا سامنا کر رہا ہے، پھر بھی حوصلہ نہیں ہارتا، جانتا ہے کہ اس کا مستقبل درخشاں ہے، اسے تو موجودہ حالات کی دشواریوں کی کوئی فکر نہیں، فکر ہے تو صرف یہی کہ آنے والی زندگی بہتر گذرے۔ دوسری طرف جو طبقہ ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزار رہا ہے وہ اگر عقیدۂ آخرت کو تسلیم نہیں کرتا تب بھی اسے یہی فکر کھائے جا رہی ہے کہ کبھی نہ کبھی تو یہ زندگی ختم ہوگی، سوچتا ہے مجھے ان چند سالوں میں کیا ملا، کچھ کما کر پس انداز کر بھی لیا تو بڑھاپا آ گیا اور طبیعت ہمیشہ کے لیے بجھ گئی، زندگی سوائے افسردگی کے کچھ نہ دے سکی، افسوس ہے اس زندگی پر، اگر وہ عقیدۂ آخرت کو مانتا ہے پھر بھی غفلت میں پڑا ہوا ہے وہ اور زیادہ قابل رحم حالت میں ہے، اپنی آتی ہوئی تباہی کو دیکھ کر بھی شتر مرغ کی طرح زمین میں سر دیے بیٹھتا ہے، یاد رکھنے کی بات ہے کہ آخرت میں جواب دہی کے عقیدہ کو نہ ماننے والے کسی کٹر سے کٹر ملحد اور دہریے کے دل میں بھی ایک نامعلوم سا خوف ضرور چھپا رہتا ہے، اس پر وہ انکار کے لاکھ پردے ڈالے لیکن دل کی یہ پھانس نکالے نہیں نکلتی ہے، اور زندگی کے لطف کو غارت کرنے پر تلی رہتی ہے، اس کے مقابلہ میں اس عقیدے کو تسلیم کر کے رب کے احکامات کے مطابق زندگی بسر کرنے والا لاکھ دنیا میں بے چین رہے اور تکلیفیں اٹھائے لیکن ایک اطمینان سا اس کے دل میں ضرور رہتا ہے جو زندگی کے لگائے ہوئے ہر زخم پر مرہم کا کام دیتا ہے، اس مرہم کو قرآن کریم نے کیا خوب بیان کیا ہے، "**إن تکونوا تألمون فإنھم یألمون کما تألمون، و ترجون من اللہ ما لا یرجون**" (اگر تمہیں زخم کھانے سے تکلیف ہوتی ہے تو تمہاری طرح تمہارے دشمنوں کو بھی تکلیف ہوتی ہے، لیکن تم اللہ سے وہ امید رکھتے ہو جو امید ان کو ہے ہی نہیں)، اس مبارک آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بات واضح کر دی کہ جو آخرت کا یقین رکھتا ہے وہ زندگی کے تمام چیلنجز کا مقابلہ کرتا ہے، اس میں یہ یقین ایک خاص قسم کی توانائی، ایک طاقت اور ایک زبردست قسم کا حوصلہ پیدا کرتا ہے، بلکہ یہی یقین حوصلوں کو جوان رکھتا ہے، دنیا کے میدان میں وہ نفع نقصان سے بالاتر ہو کر سوچتا ہے اور ہمیشہ آگے قدم رکھتا ہے، اس کیفیت کو قرآن کریم شرح صدر سے تعبیر کرتا ہے، ارشاد ہے: "**فمن یرد اللہ أن یھدیہٗ یشرح صدرہٗ للاسلام**" (جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینہ کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے) حالانکہ شرعی پابندیاں اس پر سب سے زیادہ ہیں، لیکن اندر کی خاص خوشی اس کے لیے ہر مشکل آسان بنا دیتی ہے، جیسے وہ مسافر جو سفر کی ہر صعوبت کو خوشی خوشی برداشت کرتا ہے، اس لیے کہ وہ اپنے گھر جا رہا ہے، اسی اندرونی خاص فرحت و بشاشت کو اللہ تعالیٰ "روح" کہتا ہے گویا یہی زندگی کی اصل روح ہے، ارشاد ہے: "**اولئک کتب في قلوبھم الإیمان و أیدھم بروح منہٗ**"، اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھنے والے اللہ کے دشمنوں سے قلبی تعلق نہیں رکھتے ہیں چاہے وہ ان کے انتہائی عزیز ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں، ان کے دلوں میں اللہ نے ایمان پیوست کر دیا ہے اور اپنی طرف سے خاص روحانی فیض سے ان کو طاقت عطا کی ہے، یہی روحانی فیض ہے جو زندگی کو مسرتوں سے معمور کرتا ہے، اور خاص اطمینان عطا کرتا ہے۔

اس کے مقابلہ پر اللہ اور آخرت سے غفلت کی زندگی چاہے جس قدر خوشنما نظر آئے ایک گھٹن آمیز زندگی ہے، جس میں انسان نہایت حواس باختہ، سہما ہوا، بزدل نظر آتا ہے، اس حقیقت کو قرآن کریم نے یوں بیان کیا ہے: "**ومن یرد أن یضلہٗ یجعل صدرہٗ ضیقاً حرجاً کأنما یصّعّد في السماء**" (جسے اللہ گمراہ کرنا چاہتا ہے اس کا سینہ تنگ بہت ہی تنگ کر دیتا ہے گویا وہ آسمان میں چڑھا جا رہا ہو) یعنی دل کی تنگی کی کوئی حد باقی نہیں رہتی۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ پر ایمان رکھ کر عقیدۂ آخرت کو تسلیم کرنے اور جزا و سزا کے دن پر مکمل یقین رکھنے ہی سے زندگی کا صحیح رخ متعین ہوتا ہے، جذبۂ عمل بیدار رہتا ہے، حوصلے جوان رہتے ہیں اور کچھ کر دکھانے کی امنگ رہتی ہے، زندگی کسی مرحلہ میں ٹھہرتی نہیں، ہر منزل اگلی منزل کا پتہ دیتی ہے، قرآن کریم کے الفاظ میں اس طرح "**والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا، وإن اللہ لمع المحسنین**" (جو لوگ ہمارے راستے میں جدوجہد کرتے ہیں ہم اپنے تمام راستے ان کے لیے ضرور کھول دیں گے، اللہ تو بہتر سے بہتر کام کرنے والوں کے ساتھ ہے)، ورنہ جو لوگ آخرت سے غافل ہو کر بے مقصد زندگی گزارتے ہیں ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ایسی زندگی بسر کرنے کے لیے انسان ہونا کوئی ضروری نہیں اس کے لیے جانور کافی تھے۔

عقیقہ: فضائل ومسائل

مفتی راشد حسین ندوی

عقیقہ کا لفظ ’’عق‘‘ سے مشتق ہے، جس کے معنی پھاڑنے اور کاٹنے کے ہیں، لیکن اس مقام پر عقیقہ نام ہے ان بالوں کا جو ولادت کے وقت بچہ کے سر پر پھوٹے یعنی نکلے ہوئے رہتے ہیں اور عقیقہ ان جانوروں کو بھی کہا جاتا ہے جو ساتویں روز بچہ کے بال مونڈتے وقت ذبح کیا جاتا ہے۔

عقیقہ کا حکم: بعض علماء نے عقیقہ کو واجب بھی قرار دیا ہے، لیکن اکثر علماء کے نزدیک سنت مؤکدہ ہے، جب کہ احناف کے نزدیک عقیقہ مستحب اور مسنون ہے، فقہی حکم میں خواہ اختلاف ہو لیکن احادیث میں اس کا ذکر کثرت سے آیا ہے اور بعض احادیث میں خاصی تاکید کے ساتھ آیا ہے، لہٰذا اگر مالی گنجائش ہو تو بچہ کا عقیقہ ترک نہیں کرنا چاہیے تاکہ بچہ آفات سے محفوظ رہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے: ’’ہر بچہ عقیقہ کے عوض گروی ہوتا ہے جسے ولادت کے ساتویں دن ذبح کیا جائے اس سے گندگی زائل کردی جائے اور اس کا نام رکھا جائے (ترمذی، ابو داؤد) ایک دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے ہم کو لڑکی کی طرف سے ایک اور لڑکے کی طرف سے دو بکریاں ذبح کرنے کا حکم دیا (سنن اربعہ)۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اصل حکم یہی ہے کہ لڑکے کی طرف سے دو بکرے یا بکریاں ہوں، لیکن اگر کسی کے پاس گنجائش نہیں ہے تو ایک بکرے سے بھی سنت ادا ہو جائے گی، اس لیے کہ کئی آثار میں یہ بات وارد ہوئی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت عروہ بن زبیرؓ نے لڑکے کا عقیقہ ایک بکرے ہی سے کیا (موطأ) بلکہ ایک روایت کے مطابق تو آنحضرت ﷺ نے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کا عقیقہ بھی ایک ایک مینڈھے ہی سے کیا تھا، اگرچہ دوسری روایت دو دو مینڈھوں کی بھی ہے۔ (ابوداؤد، نسائی)

پھر علماء اس پر متفق ہیں کہ عقیقہ صرف انہیں جانوروں کا درست ہے جن کی قربانی صحیح ہوتی ہے، یعنی بکرا، بکری، گائے، بیل، بھینس، بھینسا، اونٹنی، اونٹ لیکن افضل بکرے سے عقیقہ کرنا ہے اور اوپر گزر چکا ہے کہ لڑکے کے لیے دو بکرے اور لڑکی کے لیے ایک بکرا ہونا چاہیے، بقیہ جانوروں میں جس طرح سات حصے قربانی میں ہو سکتے ہیں اسی طرح عقیقہ میں بھی سات حصے ہو سکتے ہیں، اس طرح لڑکے کے لیے دو حصے اور لڑکی کے لیے ایک حصہ ہونا چاہیے، عقیقہ کے جانور میں بھی وہی تمام صفات شرط ہیں جو قربانی کے جانور میں، مثلاً جانور تمام عیوب سے پاک ہو، فربہ ہو، اگر کانا، کان کٹا ہوا، یا مکمل طور سے لنگڑا ہے، یا تہائی کان یا دم کٹی ہوئی ہے تو اس سے عقیقہ کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

اسی طرح عقیقہ کے گوشت اور کھال کے بھی وہی احکام ہیں جو قربانی کے گوشت کے ہیں کہ اس کو خود کھائے، صدقہ کرے، ہدیہ اور تحفہ میں دے یا پکا کر دعوت کرے لیکن جس طرح قربانی کے گوشت کا بیچنا ناجائز ہے، اسی طرح عقیقہ کے گوشت کا بھی بیچنا ناجائز ہے۔

پیچھے حدیث میں گزر چکا ہے کہ اس موقع پر بچہ سے گندگی دور کردی جائے گی، اس کا مطلب سر کے بال مونڈنا ہے، چنانچہ بعض دوسری احادیث میں حلق رأس کا ذکر ہے، بعض احادیث میں بالوں کے ہم وزن چاندی صدقہ کرنے کا بھی دیا گیا ہے اسی لیے علماء نے اس کو بھی مستحب قرار دیا ہے کہ بال کے ہم وزن چاندی صدقہ کردی جائے، اگر اس میں دشواری ہو تو بال کے ہم وزن چاندی کی اس وقت جو قیمت ہو وہ صدقہ کردی جائے، بال مونڈنے کے بعد مستحب یہ ہے کہ سر میں زعفران مل دیا جائے، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے حضرت بریدہ اسلمیؓ فرماتے ہیں کہ جاہلیت میں جب کسی کے یہاں ولادت ہوتی تھی تو وہ ایک بکری ذبح کرتا تھا اور بچہ کے سر کو اس کے خون سے لتھڑ دیتا تھا پھر جب اسلام آیا تو ہم بکری ذبح کرتے تھے (اور خون لتھڑنے کے بجائے) بچہ کا سر مونڈتے تھے اور زعفران مل دیتے تھے (مسند احمد)۔

اوپر گزر چکا ہے کہ اصلاً عقیقہ ساتویں روز ہی کرلیا جائے لیکن اگر کسی وجہ سے ساتویں روز نہ کرسکے تو چودہویں دن کرے اس دن بھی نہ ہوسکے تو اکیسویں دن کرے اس لیے کہ مستدرک حاکم کی ایک روایت میں ساتویں کے علاوہ چودہویں یا اکیسویں دن کے عقیقہ کا بھی ذکر ہے، بغیر کسی مجبوری کے اس سے زیادہ تاخیر نہ کرنا چاہیے، اس لیے کہ اس سے زیادہ تاخیر کرکے عقیقہ کرنا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے، اگرچہ کسی مجبوری سے ایسا ہوگیا ہو تو علماء نے بعد میں بھی کرلینے کی اجازت دی ہے، اس صورت میں مستحب یہ ہوگا کہ ساتویں دن کا خیال رکھ کر کیا جائے مثلاً اٹھائیسویں دن، پینتیسویں دن وغیرہ وغیرہ اور اگر خیال نہ رکھ سکے تب بھی کوئی حرج نہیں پھر بعض حضرات نے یہ اجازت صرف بلوغ تک دی ہے، جبکہ بعض حضرات نے بلوغ کے بعد بھی اس کو جائز قرار دیا ہے، اس طرح اگر کسی کا عقیقہ نہ ہوا ہو تو بلوغ کے بعد وہ اپنا عقیقہ خود بھی کرسکتا ہے۔

لوگوں سے متعلق کچھ غلط باتیں بھی مشہور ہیں، مثلاً ماں باپ اس گوشت کو استعمال نہیں کرسکتے، استعمال کرنا ہو تو الگ سے گوشت ملا کر ہی استعمال کریں، یا نانیہال والے اس گوشت کو نہ کھائیں یہ دونوں باتیں غلط مشہور ہیں، شریعت میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

جہاں تک عقیقہ کے وقت پڑھی جانے والی دعاؤں کا تعلق ہے تو یاد رہے کہ ان کا پڑھنا ضروری نہیں ہے، دل میں عقیقہ کی نیت ہو اور **بسم اللہ اللہ اکبر** کہہ کر ذبح کردے تو کافی ہوگا، لیکن ہم اس موقع کی دعائیں بھی نقل کردیتے ہیں تاکہ ان سے فائدہ اٹھایا جاسکے:

۱- لڑکے کا باپ جانور ذبح کرے تو اس طرح دعا کرے: **’’اللّٰھم ھذہ عقیقة ابني** (لڑکے کا نام لے) **دمھا بدمه و لحمھا بلحمه و عظمھا بعظمه و جلدھا بجلده و شعرھا بشعره اللّٰھم اجعلھا فداء لا بنی من النار‘‘**۔

۲- لڑکی کا عقیقہ ہو تو ضمیر کو مؤنث بنادے **’’اللّٰھم ھذہ عقیقة بنتي** (لڑکی کا نام لے) **دمھا بدمھا و لحمھا بلحمھا و عظمھا بعظمھا و جلدھا بجلدھا و شعرھا بشعرھا اللّٰھم اجعلھا فداء لبنتي من النار‘‘**۔

۳- ذبح کرنے والا بچہ کا باپ نہ ہو تو ابنی اور ابنتی نہ کہے صرف بچہ اور اس کے باپ کا نام لے۔

۴- اس کے بعد یوں کہے **’’اللّٰھم منک و لک‘‘** پھر **بسم اللہ اللہ اکبر** کہہ کر ذبح کردے۔

صبر و تحمل

محمود حسن حسنی ندوی

صبر و برداشت یہ وہ عظیم خصوصیت ہے جس سے بہرآور ہونا انسان کو بڑی بلندیوں تک پہنچاتا ہے، اللہ کے یہاں خصوصی تقرب اس سے حاصل ہوتا ہے، اس خصوصیت کو اختیار کر کے بندہ اپنے خالق و مالک کی معیت اختیار کر لیتا ہے، اس سے بڑھ کر کیا شرف ہوسکتا ہے، ارشاد ہے: ''إن اللہ مع الصابرین'' (بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے) بڑے سے بڑے مصائب و شدائد اور سخت سے سخت آزمائشوں اور امتحانات کا اسی بشارت کے تحت جھیلنا آسان ہوتا ہے، صدمہ کا پہلا لمحہ اصل آزمائش کا ہوتا ہے کہ اس وقت بندہ کا یقین اپنے رب پر کس قدر ہوتا ہے کہ واقعتاً وہ اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنے والا ہے یا نہیں؟ اور وہ سچے دل و دماغ سے سمجھتا ہے کہ کارساز حقیقی اللہ رب العزت کی ذات عالی ہی ہے، اور ایک پتہ بھی اس کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتا، چہ جائیکہ لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ یوں ہی ہو جایا کرتا، عمر کا معاملہ ہو یا روزی روٹی کا، ذہانت کا، حافظہ کا، قیادت کا، حکومت کا، اقتدار کا، ملکیت کا، خوشحالی کا، تنگ دستی کا، صحت کا، معذوری کا، جو بھی معاملہ ہو یہ اللہ کی طرف سے کبھی امتحان کے طور پر کبھی فضل کے نتیجہ میں، کبھی کسی نیک عمل کے بدلہ کے طور پر اور کبھی کسی جرم کی پاداش میں اس کے اعتبار سے کبھی ڈھیل کے طور پر اور کسی کو انعام کے طور پر ہوتا ہے، اور جو صبر و ہمت اور برداشت اور اندرونی قوت سے کام لیتا ہے، اور پھر اس کا بدلہ اللہ کی رضا کی صورت میں یا اللہ ہی سے اجر و ثواب کی لالچ میں چاہتا ہے تو پھر ایسے لوگ ''انما یوفی الصابرون أجرھم بغیر حساب'' کا مصداق بنتے ہیں، انبیاء کرام میں حضرت یوسفؑ بن یعقوبؑ بن اسحاقؑ بن سیدنا ابراہیمؑ کا حال ایک اعتبار سے عجب شان کا نظر آتا ہے، کیسی معصومیت میں وہ کنویں میں ڈال دیے جاتے ہیں، غیر اور پرائے نہیں اپنے یہ سازش رچتے ہیں، اپنے بھی کون؟ ایک ہی باپ کی اولاد، اور پھر یہ سازش رچنے والے اقبال جرم کے بجائے ایک پورا افسانہ گڑھ کے باپ کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہیں، باپ بھی کون! اللہ کا برگزیدہ اور صاحب کشف و بصیرت بندہ ہے، اللہ کا نبی کہ جس پر وحی بھی اترتی تھی، کیوں کہ ان کے پاس ظاہری دلائل اور بین ثبوت نہیں تھے اس لیے انہوں نے اپنی فراست سے حقیقت جان لینے کے باوجود یا وحی کے ذریعہ واقفیت حاصل کر لینے کے باوجود کسی سزا اور انتقام سے کام لینے کے بجائے، صبر و تحمل کو اختیار کیا، صبر بھی کیسا، تحمل بھی کس درجہ کا، نبی کے علاوہ کوئی اور ذات ہوتی تو اس کا دل پھٹ جاتا، دماغ کام کرنا چھوڑ دیتا، مگر حضرت یعقوبؑ کو یہ یقین رہا کہ یوسفؑ گم گشتہ ضرور واپس آئیں گے، مگر ان سخت حالات نے ان کو اس درجہ بے چین کیا کہ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی، ادھر اللہ تعالی ان کے صبر و ضبط کا امتحان لے کر حضرت یوسفؑ کو صبر و ضبط کی ایک دوسری حالت سے گزارا، کنویں میں پڑے رہے، کنواں بھی کونسا، جنگلی کنواں، شہری ہما ہمی سے دور مگر قدرت خداوندی کی کارفرمائی دیکھیے، ایک قافلہ گزرتا ہے ادھر ہی سے اور پانی کی ضرورت پا کر ڈول اس کنویں میں ڈالتا ہے، تو جمال یوسف کی رعنائیاں قافلہ کی پیاس بجھا دیتی ہیں، جسے اللہ زندہ رکھے اسے کون چکھے، اور جس ذریعہ سے اپنے قریب کرے تو کون ہے جو اسے اس سے دور کرے، غلام انہیں بنالیا جاتا پھر فروخت انہیں کیا جاتا ہے، مگر پھر بادشاہ کے دربار میں ایسی رسائی ہوتی ہے کہ سننے والا یقین نہ کرے اور دیکھنے والا اپنے ہی کو جھٹلا دے۔ صبر و ضبط کا ایک امتحان اور لیا جاتا ہے کہ بادشاہ کی بیوی ان پر فریفتہ ہو جاتی ہے، مگر وہ صاف اپنا دامن بچا لے جاتے ہیں، پھر جیل میں قید و بند کی صعوبت اٹھاتے ہیں، لیکن ہر حال میں اللہ تعالی کے رحم و کرم پر نظر اور اس کے لطف و عنایت پر نگاہ جمی رہتی ہے، والد کی یاد کیوں نہ ستائے، بھائیوں کا سلوک کیوں نہ پریشان کرے، مگر ہر حال میں وہ شکایت کو مذموم سمجھ کر اس کی پرچھائیں سے بھی دور رہے، اور طلب دعا میں یقینی کیفیت سے سرشار رہے، بالآخر اللہ نے انہیں قید سے رہائی عطا کی، اور پھر بادشاہت بھی عطا کی کہ ملک قحط زدہ ہوا، اور قحط سالی انہی کے ذریعہ دور ہوئی، اسی زمانہ میں ان کے بھائی ان کے پاس پہنچے، اور ان سے اپنے والد کے لیے وہ کرتا لے گئے جس سے ان کی بینائی لوٹ آئی، بھائی سب کے سب یہ ماجرا دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے، لیکن یہ ایسے حقائق تھے جن پر انہیں چار و ناچار یقین کرنا ہی پڑا، اور پوری شرمندگی، ندامت و خجالت کے ساتھ، ان سبھوں کو ان کے آگے جھکنا پڑا جس کے تصور سے بھی یہ لوگ خوف زدہ تھے، اور اسی خطرہ کے پیش نظر انہیں ختم کر دینے کی سازش رچی تھی، جسے اللہ نے ناکام کیا۔

عزت و غلبہ سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، جو جتنا اس کا پاس و لحاظ کرے گا اور صبر و برداشت سے کام لے گا، اور اپنے کو قابو میں رکھے گا، اللہ اس کو دوسروں پر غلبہ و اقتدار اور قابو عطا کریں گے، اور سو کی ایک یہی ہے کہ جو اللہ کا خیال اور دھیان رکھے گا اور اس کی مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے گا، اور ظلم سے گریز کرے گا اس پر عنایات الٰہی کی بارش ہو کر رہے گی، وہ ایک نہ ایک دن نوازا جائے گا، دو جملوں میں حضرت یوسفؑ نے بڑی بلیغ، ایمان افروز اور چشم کشا بات فرمادی: ''إنه من یتق و یصبر فإن اللہ لا یضیع أجر المحسنین'' (کہ بلاشبہ جو بھی تقوی اختیار کرے گا اور صبر کرے گا تو اللہ محسنین (اچھے عمل کرنے والوں) کے اجر کو ضائع نہیں کرتا)۔

تقوی اور صبر یہ دو ایسی صفات ہیں جن پر اللہ تعالی اپنے بندوں کو ہمیشہ بہت نوازتا آیا ہے، اور اس کا نوازنے کا وعدہ بھی ہے، اور جہاں اس کو اختیار کرنے اور اپنانے کا مطالبہ ہے وہیں دوسروں کو اس پر لانے کی ترغیب بھی ہے، تقوی ایمانیات و عقائد میں سب سے پہلے ہے پھر اعمال و اقوال میں، لوگوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ میں، ذاتی زندگی میں، احوال و کیفیات میں بہر حال اور ہر معاملہ میں اس کا خیال اور دھیان کہ اللہ دیکھ رہا ہے، اور اس کے علم و قدرت سے باہر کوئی چیز نہیں ہے، تو ہر معاملہ میں اس کا پاس و لحاظ، اور اس کا ڈر اور خوف، خشیت و انابت اور پھر صبر و استقامت، تحمل و برداشت اور عالی حوصلگی کا معاملہ انسان کو بڑی بلندیوں تک لے جاتا ہے، اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ایسا شخص ضائع نہیں ہوتا، اس لیے صبر کے ساتھ تقوی یعنی اللہ کا پاس و لحاظ ضروری ہے، اور تقوی اس وقت تک پورا نہیں ہوسکتا جب تک صبر سے کام نہ لیا جائے، اسی صبر و تقوی کے نتیجہ میں طمانیت قلب کی وہ دولت حاصل ہو جاتی ہے کہ آدمی دنیا میں رہ کر جنت کا لطف حاصل کرنے لگتا ہے۔

یورپین چیریٹیبل آرگنائزیشنز
حقیقت یا سراب؟

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

آزادی، مساوات اور ترقی کے نام پر خواتین کو یورپ نے کیا دیا وہ تو خواتین ہی بتا پائیں گی، لیکن امداد، علاج، تعلیم اور غذائی اجناس کی تقسیم کے بینر تلے افریقہ کے شورش زدہ علاقوں میں غربت وافلاس سے دوچار مسلمانوں کے ساتھ یورپ کیا سلوک کررہا ہے، آیئے ایک نظر ہم آپ ادھر بھی ڈالتے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ امریکہ ویورپ سے تعلق رکھنے والی عیسائی و یہودی چیریٹیبل آرگنائزیشنز کی تعداد 15 لاکھ سے زائد ہے۔ ان آرگنائزیشنز کو امریکہ اور یورپ کے باہر کام کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے، امریکی کمپنیوں کو ان چیریٹیبل آرگنائزیشنز کی امداد کرنے پر ٹیکس میں پوری چھوٹ ملتی ہے، ان آرگنائزیشنز میں سے 47 فیصد مذہبی بنیادوں پر قائم ہیں، اور وہ امداد کی آڑ میں اپنے مذہبی خفیہ مشن کو بڑے منصوبہ بند طریقوں سے انجام دیتی رہتیں ہیں۔

بات یقیناً یہ صدمہ کی ہے کہ اتنے بڑے مسلم دنیا، قدرتی ذخائر سے مالا مال دنیا، اسلامی اخلاقی تعلیمات سے بہرہ مند دنیا، ہمدردی، غمگساری اور خیر خواہی کی حامل دنیا، اس میدان میں اتنا پیچھے کیوں؟ تو آیئے اس کی وجہ بھی سن لیجئے اور بجائے اپنی اس دنیا کو برا بھلا کہنے کے اس کی بے بسی، عاجزی اور مجبوری پر آنسو بہاتے ہوئے اس کے حق میں دعا کیجئے۔

عرب مسلم دنیا سے تعلق رکھنے والے بیشتر امدادی اداروں پر یہ الزام لگا کر کہ یہ دہشت گردوں کو مالی امداد فراہم کرتے ہیں پابندی عائد کردی گئی ہے۔ اکثر بینکوں میں ان کے کھاتے منجمد کردیے گئے۔ ان تنظیموں کو چندہ دینا قابل سزا و جرم قرار دیا گیا۔ مسلم دنیا کے اسلامی ذہن رکھنے والے سرمایہ کاروں کے اکاؤنٹس چیک ہوتے رہتے ہیں، مسلم حکومتوں کو اس بات کا پابند بنایا گیا ہے کہ وہ ان تنظیموں پر نظر رکھیں، ان کی آمدنی کے ذرائع پر روک لگائیں، ان کو حکومت کے منصوبے کے مطابق کام کرنے پر مجبور کریں اور امدادی اشیاء کی تقسیم حکومت کے اہل کاروں کے ہاتھوں ہو نہ کہ تنظیموں کے ذمہ داروں کے ہاتھوں۔ اس طرح غریب مسلم ممالک میں اسلامی امدادی اداروں کو بے اثر بنانے کی کوشش کی گئی اور رفاہی کام کے مواقع ان کے ہاتھ سے چھین کر وہاں کے باشندوں سے ان کے روابط منقطع کردیے گئے تاکہ بغیر کسی رکاوٹ اور بغیر کسی حریف کے اس راستہ سے یورپ کو اپنے عزائم کی تکمیل کا پورا موقع مل سکے۔

آیئے اب دیکھتے ہیں کہ یورپ امداد میں غریب مسلم دنیا کو کیا دے رہا ہے اور اس کے پیچھے اس کا مقصد کیا ہے:

یورپین پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر رچرڈ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''یہ بڑی نامناسب بات ہے کہ جو کھانے پینے کا سامان خراب ہوجانے کی وجہ سے ہم خود استعمال نہیں کرتے وہ غریب ملکوں کے غریب عوام کو مزید پریشانیاں جھیلنے کے لیے بھیج دیتے ہیں''۔

اوکسفام امریکہ کے ایک ذمہ دار آر پی سائمنڈ نے حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا: 1979-1980 میں کمبوڈیا میں پڑے قحط کے بعد ایک امریکی چیریٹیبل آرگنائزیشن کی جانب سے کمبوڈیا کے مصیبت زدہ باشندوں کو جو غذائی اجناس روانہ کی گئیں وہ اتنی پرانی ہوچکی تھیں کہ وہاں کے زُو (Zoo) کے ڈائریکٹر نے اس غذا کو جانوروں تک کو دینے سے انکار کردیا، جبکہ غریب مریضوں میں تقسیم کے لیے جو دوائیں بھیجی گئیں وہ ایکسپائر (Expire) ہوچکی تھیں۔

ہنڈوراس میں پناہ گزینوں کے کیمپوں میں معصوم بچوں کو دینے کے لیے جو کھانے کے پیکٹ بھیجے گئے تھے ان کے اندر کھانے کا سامان اتنا خراب ہوچکا تھا کہ انسانوں کے لائق تو کیا جانوروں کے استعمال کے لائق بھی نہیں رہا تھا۔

موزمبیق کے خشک سالی سے متاثر علاقوں میں تقسیم کے لیے جو 51 ہزار ٹن اناج بھیجا گیا تھا وہ اتنا خراب ہوچکا تھا اور اس میں مٹی اور کنکریوں کی مقدار اتنی زیادہ پائی جاتی تھی کہ اس کا پکانا بھی ناممکن تھا۔

یورپ کے بعض چیریٹیبل آرگنائزیشنز کی سنگدلی اور مذہبی جنون کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان کے ورکروں نے سلفاڈ کے پناہ گزین کیمپوں میں بھوک سے نڈھال لوگوں کو کھانا بند کرنے کی دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ اگر وہ چرچ آکر عیسائی طریقے کے مطابق عبادت نہیں کریں گے تو ان کا کھانا بند کردیا جائے گا۔

برطانیہ سے شائع ہونے والے ''یورپین'' نامی ایک میگزین میں 27 ستمبر 2001 کے شمارے میں امداد کے نام پر کیے جانے والے اس فریب سے متعلق ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ رپورٹ کے مطابق 90 کی دہائی میں بوسنیا میں جاری جنگ کے دوران زخمیوں کے علاج ومعالجہ کے لیے جو دوائیں بھیجی گئی تھیں وہ دوسری عالمی جنگ کے زمانے کی تھیں۔

American Organization of Doctors Without Borders کا یہ بیان ہے کہ جنگ کے دوران بوسنیا بھیجی جانے والی 60 فیصد دوائیں استعمال کے لائق نہیں تھیں۔ سوسائٹی کے مطابق 17 ہزار ٹن دوائیں ایسی تھیں جو عالمی معیار کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے یورپ میں ممنوع تھیں اور دواساز کمپنیوں کے سامنے مسئلہ ان دواؤں کو ٹھکانے لگانے کا تھا کیونکہ ان دواؤں سے چھٹکارا حاصل کرنے پر جو خرچ آرہا تھا وہ ڈھائی کروڑ امریکی ڈالر تھا چنانچہ آسان طریقہ انہوں نے یہ نکالا کہ امداد کا لیبل لگا کر ان دواؤں کو بوسنیا روانہ کردیا اور اس طرح ان کمپنیوں نے کمالِ ہوشیاری سے ڈھائی کروڑ کی یہ رقم بچالی۔

American Organization for Future Planning نے 1999 میں کوسوفو کی جنگ میں ہونے والے زخمیوں کے لیے جو دوائیں پارسل کی تھیں ان کی قیمت 15 لاکھ ڈالر بتائی گئی، لیکن جب دواؤں کے یہ پیکٹ کھولے گئے تو ان میں استعمال شدہ کیمپ کا سامان اور معمولی قسم کی سستی دردمار دواؤں کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

یورپ وامریکہ کی طرف سے غریب ملکوں کو دی جانے والی امداد سے متعلق یہ ہیں وہ تفصیلات جو وہیں کے اخبارات ورسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

ایک عیار قوم کی عیاری کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوسکتا ہے، اکسپائر دواؤں اور سڑی گلی غذاؤں سے نجات حاصل کرنے کا ذریعہ کیا اس سے بہتر کوئی اور آپ کے ذہن میں آسکتا ہے۔ شاید اسی کو کہتے ہیں: ''نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری، رنگ آیا چوکھا''۔

فلسطینی پناہ گزیں

موت سے بدتر زندگی

محمد نفیس خاں ندوی

اسرائیل میں انتخابات ہوئے اور پھر نئی انتہا پسند حکومت برسر اقتدار آ گئی، اس حکومت کے آنے سے مسئلہ فلسطین کے حل کی راہیں بظاہر مسدود ہو گئیں، کیونکہ یہ حکومت فلسطین کے مسئلہ پر کسی بھی طرح کی مشروط گفتگو کے لیے تیار نہیں، اس کا موقف ہے کہ وہ آزاد فلسطینی مملکت کے قیام کے لیے بات چیت پر پابند نہیں اور رہا معاملہ تحریک حماس اور آزادی کے لیے جاری جدوجہد کا تو وہ اسے اپنی طاقت سے ختم کر دے گی۔ اسرائیل کے اس متشددانہ رویے نے امن کے امکانات کو معدوم کر دیا ہے اور اس کا سب سے زیادہ اثر ان فلسطینیوں پر پڑا ہے جو مختلف کیمپوں میں انتہائی کسمپرسی اور بے چارگی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں، اور ان کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔

اسرائیل کی زیادتیوں کا اندازہ عراق، لبنان (جہاں کے کیمپوں اور ان سے ملحق علاقے کی آبادی کو ''ساحلی پٹی'' کے نام سے بھی جانا جاتا ہے) اور شام و مصر کے کیمپوں میں پناہ گزیں فلسطینیوں کی حالت زار سے لگایا جا سکتا ہے، ان علاقوں میں خوراک اور زندگی کی بنیادی سہولیات کی زبردست قلت ہے، شفا خانے (Health Centres) ناکافی ہیں اور جو ہیں وہاں بھی بنیادی سہولیات مہیا نہیں، ایک معمولی تعداد ہی یہاں سے ناقص فائدہ اٹھا سکتی ہے، ان میں سے کئی شفا خانے تو ہفتہ میں ایک دو دن ہی کھلتے ہیں جس سے ان کی ''بہتر کارکردگی'' کا اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں، مریضوں کا علاج و معالجہ قیاس و اندازے پر ہوتا ہے کہ ڈاکٹروں کے پاس اتنی فرصت نہیں کہ اتنی بڑی تعداد کے حالات پوچھ سکیں، اس کے علاوہ مریضوں کے لیے جو دوائیں استعمال کی جاتی ہیں ان میں سے اکثر ناقابل استعمال (یعنی Expired) ہوتی ہیں۔

ایک تشویشناک صورت حال جو ان شفا خانوں میں نوٹ کی گئی ہے وہ یہ کہ ڈاکٹر نسخہ کچھ اور لکھتا ہے اور دوا کچھ اور دی جاتی ہے، بہت سے مریضوں کا معائنہ کیے بغیر دوسرے مریضوں پر قیاس کر کے ان کو دوا دے دی جاتی ہے، سخت بیمار کو ہاسپٹل میں داخل کرایا جاتا ہے جہاں اس کے علاج کے لیے دوائیں ناکافی ہوتی ہیں اور پھر اس کے صحت یاب ہونے سے پہلے ہی اس کو ہاسپٹل سے رخصت (Discharge) کر دیا جاتا ہے۔

ان کیمپوں میں پانی اور بجلی کی زبردست قلت ہے، خوراک کی انتہائی کمی ہے، زیادہ تر ٹماٹر اور روٹی پر گذارا کرنا پڑتا ہے جس کے لیے گھنٹوں قطار میں کھڑا رہنا پڑتا ہے، اور بسا اوقات تو وہ بھی نصیب نہیں، فاقہ کشی میں دن گذرتے ہیں، بچوں کی تعلیم کا کوئی نظم نہیں، صفائی ستھرائی کا تو تصور ہی نہیں، علاقے کوڑے کچرے کے ڈھیر سے اٹے پڑے ہیں، اور کمسن بچے ان ڈھیروں میں غذائی اشیاء تلاش کرتے رہتے ہیں، پانی اور بجلی کا بحران ہے، پانی کی نکاسی کے لیے ڈھنگ کا نظم نہیں نتیجتاً بیماریاں بڑھتی جا رہی ہیں، اور ڈاکٹروں کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے، ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ہم مالی وسائل کی کمی کا شکار ہیں، لیکن جب کوئی وی، آئی، پی ان کیمپوں کے دورہ پر آتا ہے تو خاصا اہتمام کیا جاتا ہے، اور ایک دورہ کا خرچ مریضوں کے ایک ماہ کے اخراجات سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یورپ و امریکہ کے فلاحی اداروں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ پناہ گزینوں پر لاکھوں ڈالر خرچ کر رہے ہیں حالانکہ ان کی زیادہ تر رقم سرکاری دوروں اور پروپیگنڈہ اسکیموں میں خرچ ہوتی ہیں، اور جب ان مریضوں کی دیکھ بھال کی بات آتی ہے تو مالی بحران کا واویلا مچایا جاتا ہے۔

ساٹھ سال قبل اسرائیل کے قیام کے وقت سے لے کر اب تک فلسطینی قوم اور مہاجرین کی آبادکاری کے لیے نہ جانے کتنے مظاہرے کیے جا چکے ہیں، مگر ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا بلکہ ان پناہ گزینوں کی تعداد روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ ۱۹۴۷ء کے آخری مہینوں سے لے کر ۱۹۴۹ء کے اوائل تک تقریباً سات لاکھ فلسطینی اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے، جس زمین پر وہ رہتے تھے اس کو فلسطین سے اسرائیل میں بدل دیا گیا، بہت بڑی تعداد کو طاقت کے بل پر زمین بدر کیا گیا اور ایک بڑی تعداد کو اپنی اور اپنے پریوار کی حفاظت کے لیے گھر بار چھوڑنا پڑا اور وہ کیمپوں میں پناہ لینے میں مجبور ہوئے، اقوام متحدہ کے مطابق کاغذوں میں اس وقت تقریباً سینتالیس لاکھ فلسطینی کیمپوں میں زندگی گذار رہے ہیں۔

اسرائیل نے جب غزہ پٹی پر حملہ کیا تھا تو اس وقت فوجیوں کو خاص ہدایت تھی کہ وہ شہروں کو اس طرح تباہ کر دیں کہ فلسطینی کیمپوں میں زندگی گذارنے پر مجبور ہو جائیں۔ ایک رپورٹ کے مطابق فوج کے اعلیٰ عہدیداروں کا کہنا ہے کہ جنگ بندی کے بعد جب ہم نے غزہ کو دیکھا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ ہم کامیاب ہو گئے ہیں، ہم نے غزہ کو پلٹ کر رکھ دیا تھا، وہاں کی ہر قابل ذکر عمارت تباہ ہو چکی تھی۔ اس جنگ میں اسرائیلی فوج نے ۸۰ سے زائد مساجد، تقریباً ۷۰ اسکول اور ۵۰۰ سے زائد سرکاری عمارتوں کو تباہ کیا، اس کے علاوہ فوج نے وائٹ فاسفورس، کیمیائی اور حیاتیاتی اسلحوں کا بے دریغ استعمال کیا جس کے نتائج اب ظاہر ہو رہے ہیں اور فلسطینی مختلف قسم کی بیماریوں کی لپیٹ میں ہیں، اور آئے دن کوئی نہ کوئی فلسطینی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

۲۰۰۸ء میں اسرائیل نے مغربی کنارے کے ہزاروں ہیکٹر (Hectare) زمین کو اپنا قانونی حق کہہ کر اپنے قبضہ میں لے لیا تھا، جبکہ بین الاقوامی قانون کی رو سے بھی یہ قبضہ ناجائز تھا، اور اب قبضہ پھیلتا ہی جا رہا ہے، اور یہ باور کرایا جا رہا ہے کہ سکورٹی کے تحت ایسا کرنا ناگزیر ہے، اسرائیل کے بڑھتے ہوئے ان قبضوں سے فلسطینی پناہ گزینوں کی تعداد بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

اسرائیل نے صرف فلسطینیوں کے گھر نہیں اجاڑے بلکہ ان سے ان کے جینے کا حق ہی چھین لیا ہے، بچے بچپن کی معصومیت سے محروم کر دیے گئے، عورتوں کی زندگیوں سے عصمت اور حیا جیسے الفاظ کھرچ کر پھینک دیے گئے، نوجوان جوانی کے مفہوم اور اس کے تقاضوں سے واقف بھی نہ ہو پائے، اور بوڑھے تو بس اپنی زندگی کا بوجھ ڈھو رہے ہیں، ایسی زندگی جس میں زندگی کا کوئی مفہوم نہیں۔

فلسطینیوں کی اس کسمپرسی اور بے بسی کے ذمہ دار انسانیت کے دشمن یہود، تعصب سے بھرا ہوا یورپ اور امن عالم کا ٹھیکیدار امریکہ ضرور ہے لیکن مسلم حکمرانوں کا گناہ بھی کچھ کم نہیں، ان کی بے حسی، بے غیرتی، مادہ پرستی اور سب سے بڑھ کر امریکہ نوازی نے یہ دن دکھایا کہ ۶۰ سال سے عالم اسلام کے سینہ میں اسرائیل کے ناپاک وجود کا خنجر گھپا ہوا ہے، اور یہ خنجر اسی وقت نکلے گا جب ان مسلم حکمرانوں کے اندر دینی بیداری پیدا ہوگی، تب تک اسرائیل یوں ہی ظلم ڈھاتا رہے گا اور فلسطین کے مظلوموں کو ظلم سہتے رہنا پڑے گا۔